ISSN: 3079-3319

Falcons Journal of Advanced Research

Volume: 03, Issue: (02), Article ID: FJAR-VOL3-02-26001A

Modern Urdu Short Fiction: The Intellectual and Artistic Expression of Contemporary Human Crisis

جدید اردو افسانہ: عصری انسانی بحران کی فکری اور فنی تعبیر

Muhammad Shahid[1(*)]

Abstract

This article explores how modern Urdu short fiction engages with the complex realities of contemporary life and represents them through a deeply human and artistic lens. It argues that the modern Urdu short story does not merely describe external events; rather, it interprets the inner condition of individuals living through historical upheaval, scientific development, industrial expansion, urban growth, class inequality, political instability, and shifting cultural values. In this changing environment, the individual is often shown as psychologically disturbed, socially alienated, and morally uncertain. The study demonstrates that themes such as loss of identity, loneliness, insecurity, fear, and inner fragmentation have emerged as major concerns in modern Urdu fiction because they reflect the actual pressures of present-day existence. By drawing on selected fictional passages, the article shows that Urdu fiction has responded to these realities with seriousness, symbolic depth, and critical awareness. The article further examines how terrorism, religious extremism, post-9/11 global politics, and the atmosphere of suspicion and violence have intensified the sense of crisis in modern human life and consequently in modern Urdu fiction. It finds that the modern Urdu afsana transforms social and political experiences into meaningful literary expression by linking outward disorder with inward suffering. As a result, the short story becomes more than a narrative form; it becomes a powerful medium for recording the emotional, ethical, and existential struggles of contemporary man. The article concludes that modern Urdu short fiction is both a document of its age and an artistic expression of fractured consciousness, offering valuable insight into the fears, tensions, and broken certainties that define modern existence.

Keywords: *Modern Urdu short fiction, identity crisis, insecurity, urban life, psychological fragmentation*

Received: ***February 02, 2026*** Accepted: ***April 08, 2026***

How to Cite this Paper: Shahid, M. (2026). Modern Urdu short fiction: The intellectual and artistic expression of contemporary human crisis [جدید اردو افسانہ: عصری انسانی بحران کی فکری اور فنی تعبیر]. *Falcons Journal of Advanced Research, 3*(2), 1-9. https://doi.org/10.63287/702389

[1] The Islamia University of Bahawalpur, mshahidafzal8@gmail.com (*Corresponding Author)

ISSN: 3079-3319
Volume: 3,
Issue:(02)
Feb 26 - Apr, 2026

اکیسویں صدی کے اردو افسانے کا سنجیدہ مطالعہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ یہ صنف اپنے عہد کے تاریخی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی تغیرات سے گہرا رشتہ رکھتی ہے، اور اسی رشتے کی تفہیم کے بغیر اس کے موضوعات اور فکری میلانات کو پوری طرح نہیں سمجھا جاسکتا۔ جدید دنیا میں تاریخ محض واقعات کے یکے بعد دیگرے وقوع کا نام نہیں رہی بلکہ یہ انسانی شعور، اجتماعی نفسیات اور تہذیبی رویّوں کی تشکیل کا فعال محرک بن چکی ہے۔ بیسویں صدی کی عالمی جنگوں، ایٹمی تباہی، سائنسی انکشافات، سامراجی کشمکش، عالمی سیاسی صف بندیوں اور اکیسویں صدی کے آغاز پر مسلم دنیا کو درپیش فکری، سیاسی اور معاشرتی بحرانوں نے انسانی ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے، جن کے نتائج ادب، بالخصوص اردو افسانے، میں نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکیسویں صدی کا اردو افسانہ صرف خارجی دنیا کے تغیرات کا بیان نہیں کرتا بلکہ ان تغیرات کے نتیجے میں انسان کے باطن میں پیدا ہونے والی بے یقینی، شناختی انتشار، داخلی اضطراب اور وجودی بے سمتی کو بھی اپنا موضوع بناتا ہے۔ اس عہد میں فرد سائنسی ترقی اور مادی آسائشوں کے باوجود ایک ایسے نفسیاتی اور تہذیبی خلا کا شکار دکھائی دیتا ہے جس میں اس کی شخصی پہچان کمزور پڑتی جاتی ہے اور اس کی ذات خارجی دباؤ کے زیرِ اثر تحلیل ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ جدید اردو افسانہ انسان کے اسی باطنی انہدام کو فنی اور فکری سطح پر گرفت میں لیتا ہے۔ علی حیدر ملک کے ہاں یہ صورتِ حال نہایت بامعنی انداز میں سامنے آتی ہے، جہاں شناخت کا بحران محض ایک فرد کی داخلی کیفیت نہیں رہتا بلکہ پورے عہد کا اجتماعی مسئلہ بن جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "میری پہچان نے موت کا ذائقہ چکھ لیا ہے اور اب مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں، میں ہوں۔۔۔۔ تو تم سب بھی میری ہی طرح اپنی پہچان کھو چکے ہو اور اب بے نام زندگی گزار رہے ہو۔"(1)

اس اقتباس میں "پہچان" کی "موت" اور "بے نام زندگی" جیسے اظہارات جدید انسان کی اس کٹی پھٹی داخلی حالت کی ترجمانی کرتے ہیں جس میں وہ اپنے وجود کے اثبات سے بھی محرومی محسوس کرتا ہے۔ اس طرح اکیسویں صدی کا اردو افسانہ شناخت کے مسئلے کو نہ صرف انفرادی سطح پر بلکہ تہذیبی اور عہد آفریں بحران کے طور پر پیش کرتا ہے، اور یہی پہلو اسے جدید اردو ادب میں ایک اہم فکری دستاویز کا درجہ عطا کرتا ہے۔

جدید اردو افسانے میں شناخت کے بحران کا مطالعہ اس امر کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ جدید انسان کی داخلی شکست محض ایک نفسیاتی مسئلہ نہیں بلکہ ایک وسیع سماجی، معاشی اور تہذیبی تناظر میں تشکیل پانے والی صورتِ حال ہے۔ صنعتی اور مشینی ترقی نے انسانی زندگی میں رفتار، سہولت اور مادی آسائش تو پیدا کی، لیکن اسی کے ساتھ فرد کو اس کے مانوس رشتوں، اجتماعی وابستگیوں اور داخلی سکون سے بھی دور کر دیا۔ جدید شہری معاشرہ بظاہر تنظیم، ترقی اور حرکت کی علامت ہے، مگر باطن میں وہ ایسے اضطراب، بے گانگی اور تنہائی کو جنم دیتا ہے جو فرد کی شخصیت کو بتدریج منتشر کر دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اکیسویں صدی کے افسانہ نگار کے ہاں شناخت کا مسئلہ ایک فکری استعارہ بننے کے بجائے ایک جیتی جاگتی انسانی اذیت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ فرد نہ صرف دوسروں کے لیے اجنبی ہوتا ہے بلکہ اپنی ہی یادداشت، اپنے ہی باطن اور اپنی ہی اصل سے بیگانہ دکھائی دیتا ہے۔ اس صورتِ حال میں یاد، شعور اور پہچان تینوں باہم مربوط عناصر ہونے کے باوجود تحلیل کے عمل سے گزرتے ہیں۔ رشید امجد کے افسانوی اسلوب میں یہ داخلی انتشار نہایت بلیغ علامتی پیکروں کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اس کی یادداشت کی چڑیا صدیوں کے گنجلک چہرے پر پھیلی ہوئی پہچان کو بہت دیر سے دانہ دانہ چگ رہی تھی۔ لیکن جب بہت دیر کے بعد بھی بنجر شاہتوں کی گود سے یاد کے ہمکتے بچے نے سر نہ اٹھایا تو اس کے دل میں سرسراتی خوشی مرجھاہٹ کی کھردری مٹھیوں میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔"(2)

اس میں "یادداشت کی چڑیا" محض ایک شعری ترکیب نہیں بلکہ انسانی حافظے کی اس کمزور اور مسلسل متحرک قوت کی علامت ہے جو بکھری ہوئی شناخت کو دوبارہ مجتمع کرنے کی کوشش کرتی ہے، مگر "گنجلک چہرہ" اور "بنجر شاہتیں" اس عمل کی ناکامی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اسی طرح "سرسراتی خوشی" کا "مرجھاہٹ کی کھردری مٹھیوں" میں پھڑ پھڑا کر رہ جانا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جدید انسان کی بازیافتِ ذات کی ہر کوشش خارجی جبر، داخلی شکست اور عہد کی بے رحمانہ ساخت کے ہاتھوں ادھوری رہ

ISSN: 3079-3319
Volume: 3,
Issue:(02)
Feb 26 - Apr, 2026

جاتی ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکیسویں صدی کا اردو افسانہ شناخت کے مسئلے کو صرف بیان نہیں کرتا بلکہ اس کے تہہ در تہہ نفسیاتی اور تہذیبی مضمرات کو بھی آشکار کرتا ہے، اور اسی عمل میں وہ جدید انسان کی باطنی ویرانی کو اپنے عہد کی ایک بنیادی حقیقت کے طور پر ثبت کرتا ہے۔

اردو افسانے میں جدید سماج کی طبقاتی ساخت اور اس سے پیدا ہونے والی فکری، اخلاقی اور سیاسی بے سمتی بھی ایک اہم موضوع کے طور پر سامنے آتی ہے۔ صنعتی ترقی اور سرمایہ دارانہ نظام نے جہاں مادی آسائشوں میں اضافہ کیا، وہیں سماجی طبقات کے درمیان فاصلے کو بھی گہرا کر دیا، یہاں تک کہ معاشرہ بظاہر منظم مگر باطن میں شدید ناہمواری، خوف اور تضاد کا شکار دکھائی دینے لگا۔ جدید افسانہ نگار اس طبقاتی حقیقت کو صرف معاشی سطح پر نہیں دیکھتا بلکہ اسے انسانی آزادی، شعور، سماجی اختیار اور فرد کی داخلی خود مختاری کے بحران سے جوڑ کر پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکیسویں صدی کے افسانے میں بالائی طبقات کی آسودگی، درمیانے طبقے کی مصلحت پسندی اور نچلے طبقے کی محرومی ایک ایسی اجتماعی فضا بناتی ہے جس میں انسان اپنی فطری آزادی سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس ماحول میں آزادی ایک حقیقی تجربہ نہیں رہتی بلکہ ایک ممنوع، محدود اور نگرانی میں جکڑا ہوا تصور بن جاتی ہے۔ احمد داؤد کے افسانوی اقتباس میں یہی صورت حال نہایت گہری علامتی معنویت کے ساتھ سامنے آتی ہے:

"تم آسمان کے بہت قریب رہتے ہو۔ یہ پرندے جنھیں دیکھ کر آزادی کی امنگ ابھرتی ہے کیا اس آسمان تلے واقعی آزاد ہیں؟ میں نے سہم کر اس کی طرف دیکھا اور کہا تم نے وہ تازہ ریگولیشن نہیں پڑھا جس میں پرندوں کا ذکر اور آسمان کی طرف دیکھنے کی ممانعت کی گئی ہے۔"(3)

اس پیراگراف میں "پرندے" اور "آسمان" "آزادی، وسعت اور فطری امکان کی علامتیں ہیں، لیکن ان کے ساتھ "ریگولیشن" اور "ممانعت" کا ذکر یہ ظاہر کرتا ہے کہ جدید معاشرہ انسانی زندگی کے فطری ترین مظاہر تک کو ضابطوں، پابندیوں اور خوف کے حصار میں لے آیا ہے۔ یہاں مسئلہ صرف سیاسی جبر کا نہیں بلکہ اس ذہنی فضا کا ہے جس میں فرد خود بھی اس قدر مرعوب ہو چکا ہے کہ وہ آزادی کا تصور کرتے ہوئے بھی سہم جاتا ہے۔ یہی کیفیت جدید اردو افسانے کو طبقاتی اور سیاسی شعور کی ایک اہم دستاویز بناتی ہے، کیونکہ وہ یہ واضح کرتا ہے کہ طاقت کے مراکز صرف معاشی استحصال ہی پیدا نہیں کرتے بلکہ انسانی احساس، فکر اور آرزو کے دائرے کو بھی محدود کر دیتے ہیں۔ اس طرح جدید اردو افسانہ طبقاتی تفاوت کو صرف سماجی حقیقت کے طور پر نہیں بلکہ انسانی آزادی کے بحران کے طور پر پیش کرتا ہے، اور یہی اس کی فکری گہرائی کا ایک نمایاں پہلو ہے۔

اکیسویں صدی کے اردو افسانے میں سیاسی عمل، جمہوری دعووں اور سماجی مصلحتوں کے باہمی تعلق کو بھی نہایت گہری تنقیدی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ جدید معاشرے میں جمہوریت بظاہر عوامی اختیار، نمائندگی اور آزادیِ رائے کی علامت سمجھی جاتی ہے، لیکن افسانوی متون اس تصور کے باطن میں موجود تضادات کو نمایاں کرتے ہیں۔ جب اقتدار، سرمایہ اور مفاد ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو جائیں تو جمہوری ادارے اپنی نظریاتی ساکھ کھو بیٹھتے ہیں اور محض طاقتور طبقات کے مفادات کے نگہبان بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہی صورت حال اکیسویں صدی کے اردو افسانے میں بار بار ابھرتی ہے، جہاں عوامی نمائندگی حقیقت میں عوام کی ترجمان نہیں بلکہ سیاسی مصلحت، معاشی تحفظ اور طبقاتی مفاد کا آلہ دکھائی دیتی ہے۔ اس ماحول میں فرد کا سیاسی شعور بھی آزاد نہیں رہتا، کیونکہ وہ حق، اصول اور اجتماعی ذمہ داری کے بجائے اپنے ذاتی تحفظ اور کاروباری بقا کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ علی حیدر ملک نے اس داخلی اور اجتماعی انحطاط کو نہایت سادہ مگر نہایت بامعنی مکالمے کے ذریعے واضح کیا ہے:

"ایک آدمی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: کیا کرے گا بھائی! ہم کو تو ہر پارٹی کو خوش رکھنا پڑتا ہے، سب کو برابر چندہ دیتا ہے، تاکہ کوئی بھی پاور میں آئے تو کاروبار کو کوئی نقصان نہ ہو۔"(4)

یہ اقتباس اپنی ظاہری سادگی کے باوجود جدید سیاسی معاشرے کی ایک گہری حقیقت کو عیاں کرتا ہے۔ "ہر پارٹی کو خوش رکھنا" دراصل اس ذہنیت کی علامت ہے جس میں نظریاتی وابستگی، اصولی مؤقف اور اجتماعی خیر سب پس منظر میں چلے جاتے ہیں، جبکہ ذاتی مفاد، معاشی تحفظ اور طاقت کے ساتھ سمجھوتا بنیادی قدر بن جاتا ہے۔ یہاں "لرزتی ہوئی آواز" بھی غیر اہم نہیں، کیونکہ یہ اس داخلی خوف کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کے زیرِ اثر فرد سیاسی عمل میں شریک تو ہوتا ہے مگر آزاد اور باوقار شہری

ISSN: 3079-3319
Volume: 3,
Issue:(02)
Feb 26 - Apr, 2026

کے طور پر نہیں، بلکہ ایک ایسے کمزور وجود کے طور پر جو نظام کے جبر کو سمجھتے ہوئے بھی اس کے ساتھ مفاہمت پر مجبور ہے۔ اس طرح اکیسویں صدی کا اردو افسانہ جمہوریت کے نام پر قائم اس سیاسی ڈھانچے کی تہہ میں موجود اخلاقی زوال اور سماجی بے بسی کو نمایاں کرتا ہے، اور یہ واضح کرتا ہے کہ جدید انسان کا بحران صرف ذاتی یا نفسیاتی نہیں بلکہ گہری سیاسی معنویت بھی رکھتا ہے۔ یوں یہ افسانہ اس عہد کے سیاسی شعور کو محض احتجاجی سطح پر نہیں بلکہ تہذیبی اور اخلاقی بحران کی سطح پر گرفت میں لیتا ہے۔

ان میں سیاسی اور سماجی زوال کا ایک نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ حق، اصول اور اجتماعی ذمہ داری جیسے تصورات رفتہ رفتہ مصلحت، خاموشی اور ذاتی تحفظ کے دباؤ میں دب جاتے ہیں۔ جدید زندگی میں فرد بظاہر زیادہ باشعور اور زیادہ باخبر دکھائی دیتا ہے، مگر اس کے اخلاقی فیصلوں میں وہ جرات اور استقامت باقی نہیں رہتی جو کسی زندہ معاشرے کی علامت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو افسانہ نگار اس عہد کے انسان کو صرف خارجی جبر کا شکار نہیں دکھاتا بلکہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ وہ خود اپنے اندر ایک ایسی کمزوری پیدا کر چکا ہے جس کے باعث سچائی کے ساتھ کھڑا ہونا اس کے لیے دشوار ہو گیا ہے۔ جب سیاسی نظام بدعنوانی، مفاد پرستی اور طاقت کی غیر منصفانہ تقسیم پر استوار ہو جائے تو عام آدمی رفتہ رفتہ اس صورتِ حال کو معمول سمجھنے لگتا ہے۔ نتیجتاً احتجاج کی جگہ خاموشی، اصول کی جگہ مصلحت اور حق کی جگہ بقا کی نفسیات آ جاتی ہے۔ منشایاد کے افسانوی شعور میں یہ داخلی شکست بڑی شدت سے نمایاں ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "وہ لوگ کتنے عظیم اور غیر معمولی انسان تھے جو اپنے بیٹوں کو حق کی راہ میں قربان کر دینے کا جذبہ رکھتے تھے۔ میں نے خود سے کئی بار سوال کیا ہے کہ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں مگر مجھے بڑے سے بڑے آدرش کے لیے بھی اپنی طرف سے خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں ملا۔"(5)

اس اقتباس میں "خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں ملا" محض ایک شخصی اعتراف نہیں بلکہ جدید انسان کی پوری اخلاقی پسپائی کا نوحہ ہے۔ یہاں فرد حق کو پہچانتا بھی ہے، اس کی عظمت کا اعتراف بھی کرتا ہے، مگر اس کے ساتھ وابستہ عملی تقاضوں کو پورا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اکیسویں صدی کا اردو افسانہ محض سماجی منظر نامہ پیش کرنے کے بجائے اخلاقی تحلیل کے اس عمل کو بھی بے نقاب کرتا ہے جو فرد کے باطن کو کمزور اور معاشرے کو بے حس بنا دیتا ہے۔ اس طرح جدید افسانہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ عہدِ حاضر کا بحران صرف سیاسی اداروں یا سماجی ڈھانچوں کا بحران نہیں بلکہ انسانی ارادے، اخلاقی جرات اور داخلی صداقت کے زوال کا بھی بحران ہے۔

اکیسویں صدی کے اردو افسانے کے فکری مطالعے میں یہ نکتہ بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ جدید انسان اب محض اپنے مقامی یا قومی دائرے تک محدود نہیں رہا بلکہ عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات، تحریکات اور تصادمات سے براہِ راست اثر قبول کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے افسانے میں مقامی زندگی کے مسائل اکثر عالمی سیاست، بین الاقوامی طاقت کے نظام اور تہذیبی کشمکش کے تناظر میں سامنے آتے ہیں۔ جدید عہد میں جنگ، دہشت گردی، معاشی استعمار، سائنسی ایجادات اور عالمی ذرائع ابلاغ نے انسان کے شعور کو اس طرح بدل دیا ہے کہ ایک خطے میں رونما ہونے والا واقعہ دوسرے خطے کے انسان کی نفسیات، خوف، امید اور فکری ساخت کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں صبا اکرام کا یہ تنقیدی بیان نہایت اہم ہے:

> "آج کا انسان محض کسی ایک ملک کا باشندہ نہیں، عالمی برادری کا ایک رکن ہے اور اسی لیے جو کچھ عالمی سطح پر ہوتا ہے، چاہے وہ عالمی تحریکات، واقعات اور حادثات کی صورت میں ہو یا عالمی انکشافات کے پیرائے میں، وہ اس سے اثر ضرور قبول کرتا ہے۔"(6)

یہ اردو افسانے کے مطالعے کے لیے ایک بنیادی تنقیدی زاویہ فراہم کرتا ہے، کیونکہ اس کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ جدید افسانہ اپنے عہد کے انسان کو الگ تھلگ وجود کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسے شعوری اور تہذیبی جال کے حصے کے طور پر پیش کرتا ہے جو عالمی سطح پر پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ جب اردو افسانہ شناخت، خوف، عدم تحفظ، مذہبی انتہاپسندی، سیاسی بے یقینی یا تہذیبی انتشار جیسے موضوعات کو برتتا ہے تو دراصل وہ صرف مقامی زندگی کی عکاسی نہیں کر رہا ہوتا بلکہ وہ اس وسیع تر عالمی اثرپذیری کو بھی فنی سطح پر جذب کر رہا ہوتا ہے جو جدید انسان کے تجربے کا ناگزیر حصہ بن چکی ہے۔ اس اعتبار سے اکیسویں صدی کا اردو افسانہ ایک ایسے عہد کی ادبی شہادت بن جاتا ہے جس

میں انسان کی داخلی دنیا پر خارجی واقعات کے اثرات پہلے سے کہیں زیادہ شدید اور فوری ہو گئے ہیں۔ یہی پہلو اسے محض علاقائی ادب نہیں رہنے دیتا بلکہ ایک وسیع انسانی اور عالمی تناظر سے جوڑ دیتا ہے، اور اسی میں اس کی فکری وسعت اور تنقیدی معنویت پوشیدہ ہے۔

جدید اردو افسانے میں عدمِ تحفظ کا احساس صرف خارجی حالات کا ردِّ عمل نہیں بلکہ ایک ایسی داخلی کیفیت ہے جو انسانی شعور کے اندر مستقل خوف، اندیشے اور بے یقینی کی صورت میں راسخ ہو چکی ہے۔ سائنسی ترقی، شہری پھیلاؤ، برق رفتار زندگی، حادثات، جنگی فضا، سیاسی انتشار اور سماجی بے اعتمادی نے مل کر ایسا ماحول پیدا کیا ہے جس میں انسان بظاہر معمول کی زندگی گزارتا ہے مگر باطن میں ہر لمحہ کسی نہ کسی خطرے کے امکان سے دوچار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کے ہاں سڑک، شہر، مشین، رفتار اور ہجوم جیسے مظاہر محض مناظر نہیں رہتے بلکہ خوف کے ایسے استعارے بن جاتے ہیں جو فرد کی نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس بدلتی ہوئی تہذیبی صورتِ حال میں آدمی کا رشتہ اپنے گرد و پیش سے اعتماد کے بجائے خدشے پر قائم ہوتا ہے؛ وہ چلتا پھرتا ہے، سفر کرتا ہے، روزمرہ کے معمولات نبھاتا ہے، لیکن اس کے اندر ایک مسلسل لرزہ طاری رہتا ہے۔ رشید امجد نے اسی باطنی اضطراب کو نہایت مؤثر انداز میں یوں سمیٹا ہے:

> "تار سے تار ٹکراتی ہے تو شعلہ لپکتا ہے اور گھور اندھیرا۔۔۔۔ اگر تار ٹوٹ کر مجھ پر آ گریں؟ وہ جست لگا کر سڑک کے بیچوں بیچ آ جاتا ہے ۔۔۔۔اُڑتی مٹی سے آنکھوں کو بچاتے، اسے خیال آتا ہے اگر اچانک کوئی تیز رفتار گاڑی آ جائے تو۔۔۔"(7)

اس اقتباس میں مسلسل "اگر" کی کیفیت بہت اہم ہے، کیونکہ یہی لفظ جدید انسان کے ذہنی انتشار کی اصل علامت ہے۔ وہ کسی ایک حقیقی حادثے سے نہیں، بلکہ حادثے کے امکان سے بھی زخمی ہے۔ یہی وہ نفسیاتی فضا ہے جہاں زندگی اپنی فطری روانی کھو دیتی ہے اور ہر معمول ایک پوشیدہ خطرے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس تناظر میں افسانہ عدمِ تحفظ کی محض تصویریں نہیں بناتا بلکہ اس ذہنی ساخت کو آشکار کرتا ہے جس میں انسان اپنی روزمرہ حیات کے بیچ بھی مکمل اطمینان سے محروم رہتا ہے۔ یوں جدید افسانوی تجربہ اس عہد کے اجتماعی شعور میں سرایت کر جانے والے خوف کو نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ اسے فنی سطح پر ایک ایسی معنی خیز صورت بھی عطا کرتا ہے جو سماجی حقیقت اور داخلی کیفیت، دونوں کو ایک ساتھ گرفت میں لے لیتی ہے۔

اسی فکری تناظر میں دیکھا جائے تو شہری زندگی کا پھیلاؤ، سماجی روابط کی کمزوری اور ہجوم کے اندر بڑھتی ہوئی تنہائی بھی افسانے کا ایک نہایت اہم مسئلہ بن کر سامنے آتی ہے۔ بڑے شہر بظاہر ترقی، امکانات اور حرکت کی علامت ہیں، مگر ان کے اندر رہنے والا فرد رفتہ رفتہ اپنے رشتوں، اپنے ماحول اور اپنی معنوی وابستگیوں سے محروم ہوتا جاتا ہے۔ ایک ہی بستی میں برسوں رہنے والے لوگ ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں، اور اس اجنبیت کے پسِ پشت صرف مصروفیت نہیں بلکہ وہ خوف، بے اعتمادی اور دفاعی ذہنیت بھی کارفرما ہوتی ہے جو جدید شہری معاشرے کا بنیادی وصف بن چکی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہجوم کے باوجود انسان تنہا ہے، روشنی کے باوجود ویرانی ہے، اور وسعت کے باوجود گھٹن موجود ہے۔ سمیع آہوجہ نے اس تجربے کو بڑی شدت سے یوں پیش کیا ہے:

> "نہ جانے وہاں صبح کسی لمحے شروع ہوتی اور کسی وقت شام کا شامیانہ تن جاتا۔ اس نے تو اسے ایک ہی رنگ میں دیکھا۔ گھر سے جو بھی قدم اٹھتا وہ اس کی پر پیچ بھول بھلیوں میں ہی کھو جاتا۔ اس عظیم شہر کو وہ مشینی درندے کا پیٹ کہتا جہاں وہ پانچ سال سے قید تھا۔"(8)

"مشینی درندے کا پیٹ" ایک غیر معمولی علامت ہے، کیونکہ اس میں شہر کی ظاہری عظمت، اس کی بے روح ساخت اور انسان کو نگل لینے والی فضا تینوں ایک ساتھ سمٹ آتی ہیں۔ اس اقتباس میں شہر رہائش کی جگہ نہیں بلکہ قید کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اور فرد اس کے اندر ایک زندہ مگر محصور وجود بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کیفیت کو سمجھنے میں صبا اکرام کی یہ رائے خاص رہنمائی دیتی ہے کہ:

"آج کا انسان محض کسی ایک ملک کا باشندہ نہیں، عالمی برادری کا ایک رکن ہے اور اسی لیے جو کچھ عالمی سطح پر ہوتا ہے... وہ اس سے اثر ضرور قبول کرتا ہے۔"(9)

اس تنقیدی اشارے کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ شہری تنہائی بھی صرف مقامی مسئلہ نہیں بلکہ جدید عہد کے وسیع تہذیبی اور عالمی دباؤ سے جڑی ہوئی کیفیت ہے۔

چنانچہ افسانہ جب شہر، سناٹا، اجنبیت اور بے سمتی کو موضوع بناتا ہے تو وہ دراصل جدید انسان کے اس منتشر وجود کو بیان کر رہا ہوتا ہے جو اپنے گرد پھیلی ہوئی مادی ترقی کے باوجود داخلی سطح پر شدید محرومی، گھٹن اور بیگانگی کا شکار ہے۔

نائن الیون کے بعد پیدا ہونے والی عالمی سیاسی صورتِ حال نے اردو افسانے کے فکری مزاج کو گہرے طور پر متاثر کیا، کیونکہ اس واقعے نے طاقت، دہشت، مذہب، ریاست اور انسان کی آزادی کے بارے میں پہلے سے موجود کئی تصورات کو نئی معنویت دے دی۔ اس کے بعد دنیا صرف جغرافیائی حد بندیوں کے اعتبار سے نہیں بدلی بلکہ ذہنی، تہذیبی اور سیاسی سطح پر بھی ایک نئی تقسیم وجود میں آئی، جس کے اثرات ادب میں واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ خاص طور پر مسلم معاشروں کے حوالے سے شکوک، نگرانی، جارحانہ پالیسیوں اور تہذیبی بدگمانی نے ایک ایسی فضا پیدا کی جس میں خوف اور بے یقینی روز مرہ شعور کا حصہ بن گئے۔ افسانہ نگار نے اس صورتحال کو محض خبروں یا واقعات کی سطح پر نہیں لیا بلکہ اس کے اندر کارفرما طاقت کے غیر مرئی نظام، عالمی استعمار کی چالوں اور کمزور معاشروں پر اس کے نفسیاتی اثرات کو بھی موضوع بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید افسانے میں سیاسی واقعہ ایک داخلی تجربے میں بدل جاتا ہے، اور عالمی پالیسی ایک عام انسان کے وجودی اضطراب سے جاملتی ہے۔ حمید شاہد کے افسانوی شعور میں یہ صورتِ حال علامتی انداز میں ابھرتی ہے، جہاں بیرونی طاقت کی مداخلت زمین، کھیت، جانور اور روزمرہ زندگی تک کو متاثر کرتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "یہ کتے ہمارے کھیت اُجاڑنے والوں کے عادی ہو گئے ہیں۔۔۔۔ عادی، خوفزدہ یا پھر ان ہی جیسے۔"(10)

اس اقتباس میں "کھیت اُجاڑنے والے" محض حملہ آور قوتوں کی طرف اشارہ نہیں کرتے بلکہ اس نظامِ جبر کو نمایاں کرتے ہیں جو مسلسل استحصال کے ذریعے مظلوم آبادیوں سے نہ صرف ان کے وسائل بلکہ ان کی مزاحمتی روح بھی چھین لیتا ہے۔ "عادی، خوفزدہ یا پھر ان ہی جیسے" جیسے الفاظ اس گہری نفسیاتی تباہی کو ظاہر کرتے ہیں جس میں مظلوم معاشرہ پہلے ظلم سہنے کا عادی بنتا ہے، پھر خوف میں جیتا ہے، اور بالآخر اسی جبر کی نفسیات کو اپنے اندر جذب کرنے لگتا ہے۔ یوں افسانہ یہ واضح کرتا ہے کہ عالمی سیاست کے اثرات صرف ریاستی پالیسیوں تک محدود نہیں رہتے بلکہ انسان کے ذہن، اس کے رویّے اور اس کی اخلاقی ساخت تک سرایت کر جاتے ہیں۔ یہی پہلو جدید اردو افسانے کو سیاسی شعور کی ایک اہم ادبی صورت بناتا ہے، کیونکہ وہ عالمی واقعات کے انسانی مضمرات کو محض بیانیہ سطح پر نہیں بلکہ تہذیبی اور نفسیاتی گہرائی کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔

اسی سلسلے کا دوسرا اہم رخ مذہبی جنونیت، دہشت گردی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اجتماعی بداعتمادی ہے، جس نے جدید انسان کے سماجی اور فکری وجود کو شدید متاثر کیا ہے۔ سیاسی طاقتوں کی مداخلت، جہادی تنظیموں کی پرورش، فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد کی مسلسل فضا نے مذہب کو روحانی و اخلاقی رہنمائی کے بجائے خوف، اشتعال اور جبر کے ایک مؤثر ہتھیار میں بدل دینے کی کوشش کی۔ افسانہ نگار اس مسئلے کو سطحی انداز میں نہیں برتتا بلکہ یہ دکھاتا ہے کہ اس پورے عمل میں کس طرح عام انسان، خاص طور پر نچلے اور متوسط طبقات سے تعلق رکھنے والا فرد، جذباتی استحصال کا شکار ہوتا ہے۔ اسے شہادت، قربانی اور دینی فریضے کے نام پر ایسے راستے پر ڈالا جاتا ہے جہاں اس کی ذاتی محرومیاں، معاشی مسائل اور نفسیاتی کمزوریاں ایک مخصوص سیاسی ایجنڈے کے تابع ہو جاتی ہیں۔ اس پورے تناظر کو سمجھنے میں حمید شاہد کے افسانے سے لیا گیا یہ اقتباس نہایت معنی خیز ہے:

> "آپ کو مبارک ہو آپ کا اور ہمارا معصب شہید ہو گیا۔ لاش کہاں۔ شہید کی وصیت تھی اُسے جلال آباد کے شہدا کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا جائے۔ وقت کم ہے اندھیرا پڑنے سے پہلے ہمیں پہنچنا ہے۔"(11)

اس اقتباس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ موت کو ایک جذباتی اور مقدس اعلان میں تبدیل کر دیا گیا ہے، جبکہ "لاش کہاں" جیسا سوال اس کے مقابل ایک انسانی، زمینی اور حقیقی اضطراب کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہاں افسانہ اس دوہری سطح کو بے نقاب کرتا ہے جہاں ایک طرف مذہبی اور جذباتی زبان ہے، اور دوسری طرف انسانی دکھ، محرومی اور سوال کی تلخ حقیقت۔ اسی کیفیت کو تنقیدی سطح پر سمجھنے کے لیے یہ رائے اہم ہے کہ "آج کا انسان محض کسی ایک ملک کا باشندہ نہیں، عالمی برادری کا ایک رکن ہے"، اس لیے عالمی سیاست کے تصادمات اور نظریاتی جنگیں براہِ راست اس کے سماجی رویوں اور ذہنی ساخت کو متاثر کرتی ہیں۔ اس اشارے کی روشنی میں

دیکھا جائے تو مذہبی انتہا پسندی محض ایک مقامی سماجی مسئلہ نہیں رہتی بلکہ وہ عالمی طاقتوں، سیاسی مداخلتوں اور تہذیبی خلفشار سے جڑی ہوئی ایک پیچیدہ صورتِ حال بن جاتی ہے۔ چنانچہ افسانہ اس پورے سانحے کو صرف مذمت کی سطح پر نہیں رکھتا بلکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تشدد اور جنونیت کی جڑیں کس طرح خوف، استحصال، محرومی اور منظم ذہن سازی کے اندر پیوست ہیں۔ یہی اس کی فکری قوت ہے کہ وہ اس عہد کے سب سے حساس مسئلے کو بھی جذباتی نعرے کے بجائے انسانی اور تہذیبی المیے کے طور پر پیش کرتا ہے۔

دہشت گردی اور خون ریزی سے وابستہ فضا نے جدید افسانے کو محض سماجی بیانیہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے انسانی خوف، عدمِ اعتماد اور اجتماعی اعصاب کی ٹوٹ پھوٹ کا دستاویزی اظہار بنا دیا۔ جب معاشرے میں دھماکا، ٹارگٹ کلنگ، اچانک موت، اور روزمرہ زندگی کی غیر یقینی کیفیت معمول بننے لگے تو انسان کے باطن میں ایک ایسی لرزش پیدا ہوتی ہے جو اس کے فہمِ حیات کو بدل دیتی ہے۔ افسانہ اسی بدلتی ہوئی ذہنی ساخت کو اپنے فنی نظام میں جذب کرتا ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ یہاں دہشت گردی محض ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک نفسیاتی ماحول ہے، جس میں خبر، افواہ، شور، دھماکا، چیخ، اور خاموشی سب مل کر ایک ایسے اجتماعی اضطراب کو تشکیل دیتے ہیں جو فرد کو ہر لمحہ کسی انجانے انجام کے قریب محسوس کراتا ہے۔ عرفان احمد عرفی کے ہاں یہ فضا بہت براہِ راست اور اثر انگیز اسلوب میں سامنے آتی ہے:

> "دھماکا بہت زور دار تھا۔۔۔ مجھے تو یقین ہو گیا تھا استاد کہ بس اب گئے۔"(12)

اس مختصر اقتباس کی معنوی شدت اس لیے زیادہ ہے کہ اس میں حادثے کے بعد کی تفصیل نہیں، بلکہ حادثے کے عین لمحے میں موت کے قطعی احساس کو محفوظ کیا گیا ہے۔ "بس اب گئے" جیسا جملہ انسانی شعور کے اس آخری لرزتے ہوئے مقام کی نمائندگی کرتا ہے جہاں زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ اچانک ختم ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں افسانہ دہشت گردی کے سیاسی یا نظریاتی اسباب سے آگے بڑھ کر اس کے انسانی نتیجے کو موضوع بناتا ہے۔ نجیبہ عارف نے بھی اس تناظر کو 11/9 کے بعد کے پاکستانی اردو افسانے کی ایک نمایاں جہت قرار دیا ہے، جہاں خوف محض بیرونی کیفیت نہیں رہتا بلکہ روزمرہ احساس، گفتگو اور ذہنی تربیت کا حصہ بن جاتا ہے(13)۔ اس روشنی میں دیکھا جائے تو جدید افسانہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ دہشت گردی کا اصل اثر صرف جسمانی تباہی نہیں بلکہ انسانی ذہن کے اندر مستقل ہراس، بدگمانی اور بے یقینی کا قیام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے متون میں زندگی اپنی معمول کی حرارت کھو دیتی ہے اور انسان ہر لمحہ اپنی ناپائیداری کے احساس کے ساتھ جینے پر مجبور نظر آتا ہے۔

اس پورے منظرنامے کا ایک اور نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ تشدد اور بدامنی کے تسلسل نے معاشرے میں اعتماد کے رشتوں کو کمزور کر دیا اور فرد کو اس حد تک منتشر کر دیا کہ وہ اپنے گردوپیش کی ہر حرکت کو خطرے کے امکان سے جوڑنے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کے ہاں حادثہ صرف سڑک، بازار، شہر یا جنگی منظر تک محدود نہیں رہتا بلکہ انسان کے تخیل، اس کے خواب، اس کی روزمرہ چال اور اس کی سماجی شرکت تک سرایت کر جاتا ہے۔ اے خیام کے افسانوی اقتباس میں یہ کیفیت خاص شدت سے سامنے آتی ہے:

> "دن بھر میں دو چار بڑے حادثوں کا ہو جانا کوئی ایسی مشکل بات تو تھی نہیں ۔۔۔۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ چھوٹے موٹے حادثے تو ہوتے ہی رہتے تھے۔ ان تمام حادثوں میں جو اس کی نظروں کے سامنے ہوئے وہ خود کو ہر طرح شریک محسوس کرتا۔ کبھی اپنی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی محسوس کرتا، کبھی سر پر پٹی بندھی ہوئی اور کبھی بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا بھی اس نے خود کو دیکھا تھا۔"(14)

اس اقتباس کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہاں حادثہ صرف دیکھا نہیں جا رہا بلکہ جیا جا رہا ہے۔ کردار دوسروں کے زخمی ہونے کو بھی اپنی ذات پر وارد محسوس کرتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عدمِ تحفظ کی شدید فضا میں فرد کی نفسیاتی سرحدیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور دوسروں پر گزرنے والی آفت بھی اس کے اپنے وجود کا حصہ بننے لگتی ہے۔ یہی جدید شہری اور سیاسی زندگی کا وہ المیہ ہے جسے افسانہ نہایت باریک بینی سے گرفت میں لیتا ہے۔ عبا اکرام کی یہ رائے اس تناظر میں خاص اہمیت رکھتی ہے کہ جدید افسانہ بدلتے ہوئے سماجی اور نفسیاتی رویّوں کی صورت گری کرتا ہے اور اس میں خارجی واقعہ

ISSN: 3079-3319
Volume: 3,
Issue:(02)
Feb 26 - Apr, 2026

داخلی کیفیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حادثہ یہاں محض ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک ایسی ذہنی ساخت کی تشکیل کا وسیلہ ہے جس میں انسان زندگی کو اطمینان، ربط اور تحفظ کے بجائے خوف، امکانِ زیاں اور مسلسل داخلی تناؤ کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ یہی وہ ادبی بصیرت ہے جو جدید افسانے کو محض خبر کا ردِ عمل نہیں رہنے دیتی بلکہ اسے انسانی عہد کی گہری نفسیاتی تعبیر بنا دیتی ہے۔

جدید اردو افسانے کی تنقیدی تفہیم میں چند نقاد ایسے ہیں جن کی آرا اس صنف کی فکری اور فنی جہات کو سمجھنے میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے افسانے میں تازگی، نئے لہجے اور نئے تجربے کی اہمیت کو بہت واضح انداز میں محسوس کیا۔ جمیلہ ہاشمی کے حوالے سے ان کا یہ بیان کہ

"معلوم ہوتا تھا کہ اردوافسانے میں نیا اور تازہ خون شامل ہو رہا ہے۔"(15)

دراصل اس بڑی تنقیدی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ افسانہ جب اپنے عہد کے نئے احساسات اور نئے تجربات کو جذب کرتا ہے تو وہ محض روایت کی تکرار نہیں رہتا بلکہ زندہ ادبی اظہار بن جاتا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر انوار احمد کے بارے میں ایک مستند تنقیدی مطالعے میں یہ کہا گیا کہ "ان کے ہاں روایت اور جدت کا ایک حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے" اور مزید یہ کہ انہوں نے "افسانے کے بنیادی اور اوّلین عنصر 'کہانی' کو نظر انداز نہیں کیا۔" یہ رائے جدید افسانے کے لیے نہایت اہم ہے، کیونکہ اس سے یہ اصول سامنے آتا ہے کہ اسلوبیاتی تجربہ، علامتی نظام اور فکری پیچیدگی اسی وقت بامعنی بنتی ہے جب افسانہ اپنی کہانی پن، ابلاغی قوت اور قاری سے ربط کو برقرار رکھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقید بھی اسی تناظر میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ان کی کتاب افسانہ: حقیقت سے علامت تک کا عنوان ہی اس بات کا غماز ہے کہ افسانہ محض خارجی حقیقت کی سادہ نقل نہیں بلکہ حقیقت کو علامتی، تہہ دار اور فنی سطح پر منتقل کرنے کا ذریعہ ہے؛ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید جدید افسانے کے علامتی اور فکری مطالعے میں بار بار حوالہ بنتی ہے۔

یہ آرٹیکل اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ جدید اردو افسانہ محض اپنے عہد کے واقعات کا بیان نہیں بلکہ بدلتے ہوئے تاریخی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انسانی بحران کی گہری ادبی تعبیر ہے۔ سائنسی ترقی، صنعتی معاشرہ، شہری زندگی، طبقاتی ناہمواری، سیاسی مصلحت، جمہوری زوال، دہشت گردی، نائن الیون کے بعد کی عالمی صورتِ حال، مذہبی جنونیت اور عدم تحفظ جیسے عوامل نے انسان کی داخلی دنیا کو شدید طور پر متاثر کیا، اور افسانہ نگاروں نے ان سب کو شناخت کے بحران، تنہائی، بیگانگی، خوف، نفسیاتی انتشار اور اخلاقی کمزوری کی صورت میں اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ اس بحث سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ جدید اردو افسانہ اپنے عہد کے انسان کی صرف بیرونی زندگی نہیں دکھاتا بلکہ اس کے باطن میں جاری ٹوٹ پھوٹ، اس کے شعور کی بے یقینی، اور اس کے وجودی کرب کو بھی پوری فنی اور فکری شدت کے ساتھ ظاہر کرتا ہے۔ اسی لیے یہ صنف ایک طرف اپنے زمانے کی سماجی و سیاسی دستاویز ہے، تو دوسری طرف انسانی باطن، تہذیبی زوال اور عصری حسیت کی نہایت مؤثر ادبی تشکیل بھی ہے۔

حوالہ جات

1. علی حیدر ملک، بے زمین ،بے آسمان، (کراچی: منظر پبلی کیشنز، 1986)،ص114۔
2. رشید امجد، ریت پر گرفت ،(راولپنڈی: امانت ندیم، کشمیری بازار، 1978)،ص10۔
3. اعجاز راہی، مرتب، گواہی (کراچی: عوامی دارالاشاعت، سنِ اشاعت ندارد)،ص18۔
4. علی حیدر ملک، بے زمین ،بے آسمان، (کراچی: منظر پبلی کیشنز، 1986)،ص84۔
5. منشایاد، خلا اندر خلا (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن،2010)،ص49۔
6. صبا اکرام، جدید افسانہ: چند صورتیں (کراچی: زین پبلی کیشنز، 2001)،ص72۔
7. رشید امجد، سہ پہر کی خزاں (راولپنڈی: دستاویز پبلی کیشنز،1980)،ص69۔

ISSN: 3079-3319
Volume: 3,
Issue:(02)
Feb 26 - Apr, 2026

8. رشید امجد، ڈاکٹر، مرتب، پاکستانی ادب (1947-2008): انتخاب افسانہ (اسلام آباد: اردو اکادمی ادبیاتِ پاکستان، 2009)، ص402۔
9. صبا اکرام، جدید افسانہ: چند صورتیں (کراچی: زین پبلی کیشنز، 2001)، ص74۔
10. توصیف تبسم، ڈاکٹر، مرتب، محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے (اسلام آباد: پورب اکادمی، 2009)، ص45۔
11. توصیف تبسم، ڈاکٹر، مرتب، محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے (اسلام آباد: پورب اکادمی، 2009)، ص30۔
12. صبا اکرام، جدید افسانہ: چند صورتیں (کراچی: زین پبلی کیشنز، 2001)، ص76۔
13. نجیبہ عارف، 9/11 اور پاکستانی اردو افسانہ (اسلام آباد: پورب اکادمی، 2011)، ص159۔
14. اے خیام، کپل وستو کا شہزادہ (کراچی: منظر پبلی کیشنز، 1993)، ص54۔
15. ڈاکٹر جمیل جالبی، معاصر ادب: ادبی، تنقیدی اور فکری مضامین کا مجموعہ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 1991)، ص127۔